# امت مسلمہ، دینی مدارس اور درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

نہایت قابل احترام علمائے کرام اور رفقائے عزیز!

دینی مدارس کے حوالے سے زیر بحث مسئلہ انفرادی طور پر ہم میں سے ہر ایک کو بے حد عزیز ہے۔ قومی اور ملی سطح پر اس کی بے پناہ اہمیت ہے۔ عالمی تناظر میں بڑے سوچے سمجھے طریقے سے اسے ہدف بنایا جا رہا ہے۔ اس پر سوچ بچار اور مستقبل کی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ یہ ہمارا مشترکہ مسئلہ ہے۔

دوسروں کی الزام تراشی اور مخاصمت کے محض ردعمل ہی پر اپنی ساری صلاحیتوں کو جھونکنے کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود اپنا جائزہ لیں، اور سنجیدگی سے غور کریں کہ:

- جن مقاصد کے لیے امت کے عظیم خادموں اور محسنوں نے دینی تعلیم کے پودے کی آبیاری کے لیے، ماضی میں یہ ساری کوششیں کیں اور آج بھی کر رہے ہیں، ان مقاصد کے حصول کے لیے آج کے حالات میں کیا کردار ادا کیا جا سکتا ہے؟
- اور اگر ہمارے دینی مدارس کے نظام تعلیم میں کوئی کمزوری اور خامی ہے اور مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو رہے تو اس کی اصلاح اور بہتری کے لیے کیا اقدامات کیے جا سکتے ہیں؟ اگر اس نظام کو امت کے مفادات کے برعکس کچھ خطرے درپیش ہیں تو ان سے کیسے نمٹا جا سکتا

ہے؟

ہمارے پیش نظر نہ تو کسی کو مطعون کرنا ہے اور نہ محض کسی کا بے جا دفاع کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد، افہام و تفہیم، خود احتسابی، اصلاح اور مستقبل کی تعمیر میں ایک جان دار، بامعنی اور باثمر کردار ادا کرنے کی خواہش رکھنا اور کوشش کرنا ہے، تاکہ دین حق کی بہتر خدمت کر کے، روزِ محشر، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مستحق بن سکیں۔

انفرادی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے علاوہ اسلامی تعلیمی نظام کا مقصود اگر ایک طرف تہذیبی اور علمی ورثے کی حفاظت، اعلیٰ دینی و اخلاقی قدروں کی منتقلی اور ترقی ہے، تو دوسری جانب معاشرے اور تہذیب کے لیے، سلطنت اور قوم کے لیے ایسی قیادت کی تیاری بھی ہے، جو عصری علوم و فنون سے آراستہ ہو اور جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ملک و ملت کو ترقی و فلاح کے راستے پر ڈال سکے۔

❁

ہمارے تعلیمی نظام نے مختلف ادوار میں، مختلف انداز سے یہ خدمت انجام دی ہے۔ اگر ہماری تاریخ میں کچھ قابل فخر کامیابیاں ہیں، اور لازماً ہیں تو اس میں ہمارے تعلیمی نظام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر ہمارے دامن میں ناکامیوں کے کچھ دھبے اور کچھ ہزیمتیں یا غلطیاں ہیں، تو ان کی ذمہ داری بھی اس نظام تعلیم کی کمزوریوں پر آتی ہے۔

مسلم دنیا پر مغربی اقوام کے استعماری دور میں جو سب سے بڑا سانحہ رونما ہوا، وہ یہ تھا کہ ہمارا تعلیمی نظام دو دُنیاؤں میں بٹ گیا۔ دنیاوی اعتبار سے قیادت کی تیاری اور علوم کے حصول کا سارا نظم ایک خاص سیاسی و انتظامی نظام کے سپرد کر دیا گیا۔ جب کہ مادی بے سروسامانی اور نہایت نامساعد حالات میں دین کی حفاظت، اسلامی روایات کی پاسداری، قوم کی دینی تعلیم و تربیت اور دینی قیادت کی تیاری کا کام ایک دوسرے نظام نے سنبھال لیا۔

اس مایوس کن صورت حال میں اگر خدانخواستہ یہ دینی تعلیمی نظام قائم نہ ہوتا تو اس کا تصور کر کے روح بھی لرز اٹھتی ہے کہ پھر مسلمان کس ابتلا سے دوچار ہوتے۔ اس دینی نظام تعلیم نے بڑی تاریخی خدمات انجام دی ہیں۔ آج اسلامی احیا کی جو لہریں ہمیں مشرق و مغرب میں ابھرتی نظر آ رہی ہیں، ان میں اس مذہبی تعلیمی نظام کا محسوس اور غیر محسوس دونوں سطح پر ایک بڑا بنیادی کردار ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی تیار کردہ افرادی قوت ملک و ملت کی صرف جزوی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے۔ کلی ضرورتوں کو پورا کرنے کا کام امت مسلمہ اور خود دینی درس گاہوں کے اکابرین کے سامنے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اسلامی ریاست، اسلامی معاشرے، اسلامی تہذیب اور امت مسلمہ کے لیے معیاری اور مثالی نظام تعلیم کے خدوخال کو نمایاں کیا جائے اور اسے بہ تمام و کمال روبہ عمل لایا جائے۔ ایک ایسا نظام تعلیم جو دین اسلام کے تابع ہو اور زندگی کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے اور معاشرے کی ہر نوع کی احتیاج کے لیے موزوں افراد کار تیار کرنے کا کام انجام دے سکے۔ یہ چیلنج ہمارے اہداف، ہماری منزل اور ہمارے زاد راہ سے متعلق ہے۔ جس سے کسی بھی صاحب ایمان، ذی علم اور ذی شعور مسلمان کے لیے صرف نظر ممکن نہیں۔

موجودہ حالات میں اس عظیم اور ناگزیر کام کی عملی صورت یہ ہے کہ دینی تعلیم کے موجودہ نظام کی خوبیوں، خامیوں، گنجائشوں اور اصلاح طلب پہلوؤں کا تجزیہ کیا جائے۔ تعلیمی نظام کے مقاصد کی روشنی میں پوری بالغ نظری سے تجزیہ کرنے کے بعد اصلاح احوال کی سنجیدہ کوششیں کی جائیں۔ اس کی خوبیوں کو شاندار بنانے اور خامیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔

اس نظام تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ یہاں پر دینی علوم کے ایسے ماہرین تیار کیے جائیں جن کی نظر قرآن و سنت، تاریخ اور اپنے دور کے مسائل و حالات پر ہو، وہ علمی، فکری، تہذیبی، ثقافتی ہر میدان میں دین حق کی صحیح نمائندگی کرتے ہوئے دین کی بات کو دلیل کی قوت کے ساتھ پیش کر سکیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ بظاہر محدود اور متعین ضروریات یعنی مسجد اور مدرسہ کی ضروریات کی

تکمیل کا بھی پورا پورا اہتمام اور گنجائش اس نظام میں موجود ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسجد اور مدرسہ کوئی محدود یا کم اہم مراکز نہیں بلکہ یہ بھی اتنے ہی اہم شعبے ہیں جتنا کہ پارلیمنٹ، ایوان تجارت، فوج اور ٹیکنالوجی کے مراکز۔ اس مستقل ضرورت کو پورا کرنے کی تگ و دو کرنا کوئی دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔

ہمیں ایسی دینی قیادت چاہیے، جو دین کے فہم و ادراک کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو سمجھتی ہو اور دینی فہم و فراست کے ساتھ ان مسائل و معاملات کا درست جواب دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ بلاشبہ معاشرتی زندگی کے ہر شعبے کے لیے اسپیشلسٹ اور خصوصی ماہرین چاہییں، تاکہ وہ قیادت کی ذمہ داریاں ادا کر سکیں۔ اس میں معیشت کا شعبہ ہو یا سائنس، ادب، فوج، سیاسیات، قانون، ٹکنالوجی کا میدان ہو، ہر شعبے میں دین اسلام کے تقاضوں کے مطابق اور امت مسلمہ کے خوابوں کی تعبیر والے ایسے ماہر اور قائد پیدا ہوں، جو ایک طرف اپنے فن میں پوری استعداد رکھتے ہوں، تو دوسری طرف ان کا ایمان، فہم دین، اپنے علم اور اپنے شعبے کو مقصد حیات سے مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ایسے افراد کار تیار کرنے کی ضرورت ہوگی، جو ایک طرف اپنے فن کے ماہر ہوں اور دوسری طرف انھیں دین کا کم از کم وہ فہم اور وزن حاصل ہو کہ اپنے اپنے فن کے دائرے میں، اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اللہ کی بندگی، اللہ کے بندوں کا تزکیہ، اللہ کے بندوں کی قیادت، اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کام کرنے کے لائق بن سکیں۔ گویا کہ ایسے ادارے ہمیشہ درکار رہوں گے جو دینی علوم کے اسپیشلسٹ اور خصوصی ماہرین تیار کریں۔

مطلب یہ کہ دینی مدارس کا اولین کام دینی قیادت فراہم کرنا ہے، جس میں ایک طرف تو مسجد میں آباد رہیں، اور مدارس اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں۔ دوسری جانب علمی میدان میں دین کا دفاع اور دعوتی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے ایسے افراد ہمارے پاس موجود ہوں، جو دین کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔ بلاشبہ یہ بڑی اہم ضرورت ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ دینی مدارس

نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوشش بھی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سوچنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے باقی تمام شعبوں کے لیے اسلامی ذہن، اسلامی کردار، اسلامی وژن رکھنے والی قیادت ہم کہاں سے لائیں گے؟ ہمیں اس بات پر سوچ بچار کرنا چاہیے کہ دینی تعلیم کے ادارے کس طرح معاشرے، تہذیب اور ملت کی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی کوئی حصہ ادا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو سیکولر یونیورسٹیوں کے سانچوں میں ڈھال لیں۔ نہیں، وہ اپنے دینی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے بعض مقامات پر ایسے نظام اور اداروں کو روبہ عمل لا سکتے ہیں، جہاں اس ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام ممکن ہے۔

میں نے اس معاملے پر جتنا بھی غور کیا ہے وہ پورے ادب سے آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ایک طرف ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ سب سے پہلے تو معیار مطلوب کے تصور کو حقیقی تناظر میں سمجھیں۔ اس کے حصول کے راستے تلاش کریں اور ان منزلوں پر پہنچنے کے لیے کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے پہلے ایک عبوری دور بھی ہے۔ اس عبوری دور کے لیے یہ سوچیں کہ کس طرح اس معیار مطلوب تک پہنچنے اور منزل مقصود کی طرف بڑھنے کی ٹھوس راہیں استوار کی جا سکتی ہیں۔

اس ضمن میں میرے ذہن میں یہ پہلو آتے ہیں:

ایک طرف جدید تعلیمی اداروں میں ایسی بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں، جن کے ذریعے آہستہ آہستہ وہ معیار مطلوب کی طرف آ سکیں۔

دوسری طرف دینی تعلیمی نظام کے تشخص اور اس کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے، اس میں ایسی اندرونی اصلاحات اور ترقیات کی کوشش کی جائے، کہ جو اسے صرف نئی دینی قیادت ہی نہیں

بلکہ نئی تہذیبی قیادت کی تیاری کا ذریعہ بنا سکیں، جس سے دینی نظام تعلیم، عصر حاضر کے لیے مربوط اور موزوں بن سکے۔ میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ اس وقت کا دینی نظام تعلیم، موجودہ تہذیبی چیلنج کا جواب دینے کے لیے کارآمد، کارگر اور مربوط نہیں رہا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک مذہبی قیادت تو ضرور پیدا کر رہا ہے، جو اپنی جگہ پر بہت بڑی خدمت ہے، لیکن وہ مردان کار جو اسلامی تہذیبی قیادت کے لیے کارآمد ہوں، وہ اس وقت موجود نہیں اور نہ تیار ہی ہو رہے ہیں۔

بہرحال، ایسی مطلوبہ قیادت کی تیاری اور موجودگی کا پاس ولحاظ اپنی جگہ، مگر اس قیمت پر اسے حاصل کرنے کی ہم جسارت بھی نہیں کر سکتے کہ موجودہ دینی نظام تعلیم کا تشخص اور رہا سہا کردار مجروح، متاثر، کمزور یا تحلیل ہو کر رہ جائے۔ یہ پیش رفت ان کے وجود اور تشخص کی قیمت پر نہیں، البتہ اس میں معنوی بہتری، دانش مندانہ اضافے اور حکیمانہ تبدیلیوں کی صورت میں ہونی چاہیے۔ جو اس کے تیار کردہ افراد کو دوسرے طاقت ور تعلیمی دھارے (اسٹریم) میں داخل ہونے کے لائق بنا سکے۔

گویا کہ جدید نظامِ تعلیم میں یہ گنجائش پیدا کی جائے، کہ دینی تعلیم سے فارغ ہونے والے لوگ اس کے اندر آ سکیں۔ حصول علم کی جدوجہد میں وہ اجنبی نہ ہوں، بلکہ اس سے استفادہ کر سکیں اور ایک سطح پر وہ اس کا حصہ بن سکیں۔ یہ وہ مطلوب منزل ہے، جس پر پہنچ کر تعلیم کے لیے دو الگ الگ نظاموں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ دونوں نظام ایک ہی جامع نظام کا حصہ بن جائیں گے۔ یہ ہمارا خواب اور ہماری منزل ہے، جسے کسی صورت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے، کہ اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے عبوری دور میں ہم کیا کریں؟

اس کے لیے پہلے مرحلے میں تو ان دونوں نظاموں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان ہم ایسے راستے، وسیلے اور channels بنا دیں، کہ جن کے ذریعے افراد ایک دوسرے کے تعلیمی نظام میں جا سکیں۔ بلاشبہ

اس سہولت سے دونوں نظاموں کے فارغ التحصیل تمام لوگ تو استفادہ نہیں کریں گے۔ لیکن، اس سے دونوں میں ایک دوسرے کو قبول کرنے کی فضا ضرور پیدا ہوگی اور اجنبیت میں کمی واقع ہوگی، جس کا آخر کار فائدہ ہوگا۔ اس حوالے سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد نے بڑے ابتدائی انداز میں پیش رفت کی ہے۔ مجھے اس بات کی سعادت حاصل ہوئی کہ میں نے اس کا بنیادی مسودہ لکھا۔ تعلیمی اعتبار سے آگے بڑھنے کے لیے ہمارے خوابوں کی یہ ایک چھوٹی سی مگر نہایت قیمتی تعبیر ہے۔

آئندہ بھی کچھ ایسے ادارے قائم کیے جائیں کہ جہاں پر یہ دونوں دھارے آ کر مل سکیں۔ ان دونوں تعلیمی دھاروں میں یہ گنجائش پیدا ہونی چاہیے کہ باقاعدہ اپنا اپنا تشخص اور وجود رکھنے کے باوجود ان کے درمیان ایسے راستے بن جائیں کہ ایک دوسرے سے علمی استفادہ ہو سکے۔ یہ اہتمام اس عبوری اور transitional دور کے لیے ہونا چاہیے۔ پھر اللہ تعالیٰ وہ وقت لائے کہ کسی جبر اور کسی بیرونی مداخلت کے ذریعے نہیں، کسی عالمی منصوبے یا کسی مقامی سازش کے تحت نہیں، بلکہ ان دونوں نظاموں کے مخلص اور باصلاحیت اصحاب علم مل کر اس منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ سوچ کا یہ وہ وسیع افق ہے جسے اہلِ نظر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ہاں نئے تجربات کرنے، نئی راہیں استوار کرنے اور دو تعلیمی دھاروں میں پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے اور کم کرنے پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔

یہاں پر میں ترکی کی مثال دوں گا، جہاں سیکولر قوتوں نے جبر کا ہتھیار استعمال کر کے دینی تعلیم کا نظام بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔ پھر ۳۵ برس بعد وزیر اعظم عدنان مینڈریس کے زمانے میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ یہ کہ ایسے دینی مدارس قائم کرنے کی اجازت دی گئی، جنھیں ''امام خطیب اسکول'' کہتے تھے، جس کے ابتدائی اور ثانوی دو درجے تھے۔ یہاں پر عربی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ جب ہم گزشتہ چالیس برس کے ترکی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس ایک اقدام نے کئی انقلابی تبدیلیوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ہوا یہ کہ، امام خطیب اسکول کے فارغ طلبہ

کے لیے ہر مضمون میں جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع پیدا ہوا۔

وہ طالب علم، جس نے سات آٹھ برس تک امام خطیب اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی، اسے اس تعلیمی دورانیے میں براہ راست اسلامی علوم کے ماخذ تک رسائی پانے کا موقع میسر آیا۔ اس عمل نے فرد کی ذہنی ساخت، فکر ونظر کے زاویے اور معاملات زندگی دیکھنے کے اسلوب تک پر گہرا اثر ڈالا۔ اس لیے اب وہ صرف اسلامیات یا الٰہیات ہی کے مضامین میں نہیں، بلکہ اپنی استعداد اور قابلیت کی بنا پر ہر مضمون کا انتخاب کر سکتے تھے۔ یونی ورسٹی کے شعبہ جات مثلاً فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، قانون، نفسیات، ادبیات، تاریخ، بین الاقوامی امور، انتظامیات، زراعت سبھی میں جانے کے لیے ان کے پاس مواقع موجود تھے۔ اور اگر کوئی طالب علم چند برس سائنس کی تعلیم حاصل کر کے انجینئرنگ یا میڈیسن میں جانا چاہتا تو وہ وہاں بھی جا سکتا تھا۔

گزشتہ پچیس برس کے دوران متعدد بار مجھے ترکی جانے اور وہاں تعلیمی تبدیلیوں اور ان کے اثرات کو دلچسپی اور توجہ سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس ایک تعلیمی سلسلے نے نوجوانوں میں دینی حوالے سے تبدیلی کے لیے فضا پیدا کی اور اس ذریعے سے سرکاری ملازمین، فوج، ذرائع ابلاغ، اساتذہ وغیرہ میں جتنے غیر معمولی اثرات پھیلے وہ کئی باقاعدہ دینی تنظیموں سے بھی زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کی سیکولر لابی تلملا کر رہ گئی ہے اور اب یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ ''خطیب امام اسکولوں کے فارغ طلبہ صرف الٰہیات فیکلٹی ہی میں داخلہ لینے کے حق دار ہوں گے، انھیں کسی دوسرے شعبے میں داخلہ نہیں دیا جائے گا۔'' جمہوریت، سیکولرزم، حریت فکر، مساوات اور انسانی حقوق کے تمام بلند بانگ دعوے، محض چند صاحب علم دین دار لوگوں کا راستہ روکنے کے لیے خاک میں اڑا دیے گئے ہیں۔

ترکی اور بنگلہ دیش میں دینی تعلیم کے انقلاب انگیز تجربے کی روشنی میں، علمائے کرام اگر کشادگی کا راستہ اختیار کریں گے تو اس سے دینی قوتوں میں وسعت اور معاشرے پر نہایت مثبت اثرات پیدا ہوں گے۔

یہ کام صرف علماء کا نہیں ہے، بلکہ یہاں کے دوسرے سوچنے سمجھنے والوں، پالیسی سازوں اور حکومت کی ذمہ داریوں پر فائز سول اور منتخب افراد کی بھی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ہر ذمہ دار اور با اختیار فرد پہلے مسلمان ہے اور بعد میں کوئی دوسری حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے انھیں غور کرنا چاہیے کہ ہم وہ کون سا انتظام کریں کہ جس سے تعلیم کے یہ دونوں متحارب نظام ایک دوسرے سے قریب لائے جاسکیں، جو زیادہ بہتر، متوازن اور ایمان و اخلاق سے سرشار قیادت فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔

مغرب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف انداز میں اسلام، اس کے مآخذ اور اس کی تعلیمات کو ہدف بنایا ہے۔ قرآن پاک، اس کی حقانیت اور صداقت کو ہدف بنانا، نبی پاکؐ کی سیرت مطہرہ، ان کی ذات اقدس کو متنازعہ بنانا اور اسلام کے تصور اور اسلام کی عالمگیر جہت کو ہدف تنقید بنانا مغرب کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں کی طرح آج پھر قرآن، سیرت، جہاد اور امت کو ہدف بنا کر ان پر حملے جاری ہیں۔

۲۱ ویں صدی میں مسلمانوں کے حوالے سے جن الفاظ کو سب سے بڑا ہوّا بنا کر تواتر کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے، وہ ہیں جہاد، تنگ نظری اور عدم برداشت کے الفاظ۔ اس کے منبع کے طور پر دینی مدارس کو پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ایک عالمگیر مہم ہے، جس کی صدائے بازگشت خود مسلمان حکمرانوں، صحافیوں اور ہر مسلم ملک کے سیکولر عناصر کے قلب و زبان سے سنی جاسکتی ہے۔

اس پس منظر میں ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ خود اپنے حالات کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہم کس طرح اسلام کے حقیقی پیغام کو مدلل انداز میں پیش کرنے کے لائق بن سکتے ہیں؟ اور ہمارے دینی تعلیمی ادارے کس طرح اس فضا کو بنانے، اور مطلوب پیغام کو پھیلانے کے قابل بن سکتے ہیں؟ ان امور پر غور و فکر کے دوران ہمیں محض دفاع کے جذبے سے نہیں اور نہ ہی صرف ردعمل

کے طور پر، بلکہ اصلاح اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کردار ادا کرنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کے لیے کہاں اور کس قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ رائے عامہ کو تیار کرنے، قوت اور اعتماد پیدا کرنے اور عالمی فضا کو بدلنے کے لیے ہم کیا حکمت عملی وضع کر سکتے ہیں؟

علمائے کرام نے دینی مدارس میں جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے، اس میں ایک بڑی وجہ اُن کی آزادی ہے۔ خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت جس عزم صمیم کا اظہار کیا گیا، وہ ایمان وعزیمت کا ایک روشن باب ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے فرمایا تھا ''ہم روکھی سوکھی کھائیں گے، زمین پر بیٹھ کر تعلیم لیں گے اور تعلیم دیں گے، لیکن کسی سرکار کی سرپرستی حاصل نہیں کریں گے''۔ ان کا یہ اقدام بڑی بالغ نظری پر مبنی تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے نظام تعلیم کو مغربی استعمار اور مغرب زدہ انتظامیہ اور اشرافیہ کے بہت سے منفی اثرات سے بچالیا۔

تاہم اس ضرورت کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ دی جاسکی کہ ہر لحہ چندے کے لیے فکرمند رہنے کے بجائے متبادل ذرائع یعنی ''وقف'' وغیرہ کو اختیار کر لیا جائے۔ حالانکہ تاریخی طور پر اسلامی تاریخ وتہذیب میں ''وقف'' ایک ایسا طاقت ور ادارہ رہا ہے، جس نے تعلیمی ادارے کی آزادی کی ضمانت فراہم کرنے کے ساتھ اسے وسائل کی فراوانی دی۔

مسلم تہذیب وتاریخ کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ کئی صدیوں تک ہمارے آباواجداد نے یونیورسل تعلیم کا انتظام کیا۔ یہ تعلیم کوئی محدود معنوں میں محض مذہبی تعلیم نہ تھی، بلکہ دینی فہم وفراست کے ساتھ اس میں سارے میدانوں کی تعلیم شامل تھی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تعلیم پھیلانے اور تعلیم حاصل کرنے کے شوق وذوق کے باوجود، اسلامی تہذیب میں تعلیم کو کبھی جنس تجارت نہ سمجھا گیا۔ بلاشبہ بعض سطحوں پر اتالیق [پرائیویٹ ٹیوٹر] مقرر کرنے کا بھی رواج رہا، مگر یہ کبھی عام رواج نہیں بنا، یہ سلسلہ محدود پیمانے پر اور چند ہی لوگوں تک رہا۔ اس کے برعکس عام سطح پر تمام لوگوں کے لیے تعلیم کے یکساں مواقع کی فراہمی، اسلامی تہذیب کا ایک منفرد پہلو رہا ہے۔ اس

چیز کو سہارا دینے، پروان چڑھانے اور حریت فکر کو تحفظ دینے کے لیے جس ذریعہ نے سب سے اہم کردار ادا کیا، بلاشبہ وہ ''وقف'' ہی تھا۔ اس نے نہایت اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے اور بلند پایہ یونی ورسٹیاں قائم کیں، جو آج کی زبان میں ''اسٹیٹ آف دی آرٹ'' میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔

اس تناظر میں دینی مدارس کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے، جو ایک طرف ان کی آزادی کو برقرار رکھے، لیکن دوسری طرف ان کے لیے بلا انقطاع مالی وسائل بھی فراہم کر سکے۔ میں اس بات کا حامی ہوں کہ ایک مسلمان حکومت کی جانب سے لازماً دینی تعلیمی اداروں کی مالی مدد اور سرپرستی ہونی چاہیے۔ یہ حکومت کا احسان نہیں بلکہ ان اداروں کا حق ہے۔ کچھ حدود کے اندر اور ایک فریم ورک میں رہتے ہوئے مدد لینے کے راستوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج ایک طرف ریاست بنگلہ دیش تو دینی تعلیمی اداروں کو پانچ سو کروڑ ٹکہ (روپے) سے زیادہ مالی معاونت فراہم کر رہی ہے، لیکن دوسری جانب حکومت پاکستان ملک بھر کے دینی تعلیمی اداروں کو پندرہ لاکھ روپے سالانہ کی حقیری مالی مدد دے رہی ہے، جو یقیناً باعث شرم ہے۔

اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں دینی مدارس کی مالی معاونت کا ریاستی سطح پر نظام ہو، وہاں اس امر کو بھی یقینی بنایا جائے کہ مدارس کی خودمختاری اور آزادی حکومت کی سیاسی مداخلت سے آلودہ نہ ہو سکے۔ جس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اکابرین امت اور علمائے حق نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں، اسے چند سکوں اور نوٹوں کے عوض قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے لیے وہ ماڈل ہرگز قابل قبول نہیں ہونا چاہیے جس طرح بعض مسلم ممالک میں مسجدوں کو سرکاری انتظام میں لے کر خطیب یا امام ایک تنخواہ دار سرکاری ملازم کے طور پر مقرر کیے جاتے ہیں۔

''وقف'' کے ذریعے خودمختاری کے تحفظ کی جدوجہد کرنا ہم سب اہل ملت کی اولین ذمہ داری ہے۔ دینی مدارس کے مقاصد، تدریس، تعلیم اور نصاب کو دین اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق سنوارنے اور چلانے کا اگر دینی قیادت نے پاس نہ کیا تو ہم آنے والی نسلوں کے لیے ببول کے کانٹے اور صحرا کی تپش ہی چھوڑ کر جائیں گے۔ اس لیے بڑے ادب سے درخواست کروں

گا کہ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ کام خود ہی کرنا ہوگا، اسے باہر سے کوئی ادارہ یا ایجنسی نافذ کرے گی تو یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا، بلکہ اس کا الٹا نتیجہ نکلے گا۔ اس لیے یہ کام خود ہی کرنا ہوگا۔ ہمدرد اور دردِ دل رکھنے والے افراد کے مشوروں، بحث، اور منصوبہ بندی سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے اس پر عمل درآمد کی سبیل سوچنی چاہیے۔

دینی مدارس کے خلاف جو بھی اندرونی یا بیرونی سازشیں ہو رہی ہیں، ان اداروں کو کمزور کرنے اور غلط رنگ میں پیش کرنے کی جو بھی منفی کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا علاج ردِ عمل میں محض جوابی تقریریں کرنا نہیں ہے۔ اور نہ اس چیز کا تدارک یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنی کمزوریوں یا خامیوں کو بھی دانش اور بصیرت کا پرتو ہی قرار دیا جائے۔ بلکہ اس مسئلے کا علاج یہ ہے کہ جس منصب پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فائز کیا ہے، اس کا احساس کیا جائے، ان لمحوں کو غنیمت جانتے ہوئے اور پراپیگنڈے کو نظر انداز کرتے ہوئے، خود مسائل کو حل کرنا چاہیے۔